٦

اسلام میں قانون سازی کا تصور اور طریق کار

شریعۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

سلسلہ مطالعہ اسلامی قانون (٦)

اسلام میں قانون سازی کا تصور اور طریق کار

شہزاد اقبال شام

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

اسلام میں قانون سازی کا تصوّر اور طریق کار

تالیف: شہزاد اقبال شام

نظر ثانی وراہ نمائی:
۱۔ جسٹس ڈاکٹر فدا محمد خان
۲۔ پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن
۳۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی

نگران شعبہ مطالعہ اسلامی قانون: ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں

نگران منشورات: ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین

ناشر: شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

طابع: اظہار پرنٹرز۔۹، ریٹی گن روڈ لاہور

طباعت: اوّل: ۱۹۹۳ء ، دوم: ۱۹۹۶ء ، سوم: ۲۰۰۲ء
چہارم: ۲۰۰۳ء ، پنجم: ۲۰۰۴ء ، ششم: ۲۰۰۶ء

قیمت: ۳۰ روپے

فہرست مضامین

صفحہ نمبر

۱۔ کائنات کا اقتدار اعلیٰ ۱

۲۔ انسان کا مرتبہ و مقام ۲

۳۔ قانون سازی کے بنیادی اسلامی تصورات ۴

(۱) اجتماعی حکومت کا تصور ۵

(۲) رعایا سے اطاعت کا مطالبہ ۷

۴۔ قانون سازی کے لوازم ۸

(۱) مشاورت اور اس کے فوائد ۸

ا۔ اجتماعی ذمہ داری ۸

ب۔ مکمل معلومات کا حصول ۱۰

(۲) مشاورت کے لوازم ۱۰

ا۔ اختلاف رائے کے حق کا احترام ۱۰

ب۔ اہل ترین افراد کا انتخاب ۱۱

ج۔ انفرادی آراء پر اجتماعی آراء کی فوقیت ۱۲

د۔ عزم صمیم اور اللہ پر توکل ۱۳

و۔ احکام الٰہی کی پابندی اور ملکی دستور ۱۳

۵۔ اسلام کا نظام قانون سازی ۱۶

(۱) مقننہ کے ذریعے قانون سازی ۱۶

(۲) انتظامیہ کے ذریعے قانون سازی ۱۷

(۳) عدلیہ کے ذریعے قانون سازی ۱۹

٦ - اسلامی قانون سازی میں عرف کا مقام	۲۲
۷ - عرف شرع اور عرف اہل زمانہ میں تعارض	۲۵
۸ - عرف کی اقسام	۲٦
(۱) عرف عام	۲٦
(۲) عرف خاص	۲٦
۹ - عرف قبول کرنے کی شرطیں	۲۷
۱۰ - مزید مطالعہ کے لئے	۲۷
۱۱ - حواشی و حوالہ جات	۲۸
۱۲ - مصادر و مراجع	۲۹

پیش لفظ

اسلام کی طویل فکری اور عملی تاریخ میں مسلم اہل علم و دانش کو گوناگوں چیلنجوں اور مبارزتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دور تابعین میں وضع حدیث اور قضاء و قدر کے بارہ میں شبہات سے لے کر دور جدید کے مغربی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے استیلاء تک کا یہ سارا زمانہ ایک مسلسل فکری جہاد اور علمی دفاع سے عبارت ہے۔ اس پورے دور میں اہل علم نے نہ صرف حالات زمانہ کو پیش نظر رکھا' بلکہ ہر نئی فکری مبارزت کے جواب میں اکثر و بیشتر انہی ہتھیاروں اور وسائل سے کام لیا جن سے کام لے کر اسلام پر اعتراضات کئے گئے۔ اس کی کامیاب ترین مثال یونانی علوم و فنون سے مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ ابتدائی سو' سوا سو سال کے عبوری دور کے بعد بھی مسلمان مفکرین نے یونانی منطق اور فلسفہ سے اسلامی عقائد کی تفسیر و توضیح کی اور اسلامی تعلیمات کی تبیین و تفہیم کا وہ کام لینا شروع کر دیا تھا جس کے عجیب و غریب نمونے امام غزالی' امام رازی' امام شاطبی اور شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ کی تحریروں میں ملتے ہیں۔

دور جدید میں اس کام کی اہمیت اور پیچیدگی پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ پہلے مبارزت صرف ایک میدان میں تھی' یعنی فلسفہ' منطق اور عقلیات کا میدان۔ اب یہ مبارزت زندگی کے ہر میدان میں ہے۔ فلسفہ اور انسانی علوم سے لے کر روزمرہ زندگی کے مظاہر تک' آج ہر قدم پر دنیائے اسلام کو بیرونی اور خارجی قوتوں سے قدم قدم پر نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے۔ ان میں سے بعض مقامات میں یہ نبرد آزمائی نسبتاً زیادہ اہم اور فوری نوعیت کی ہے اور حالات کا تقاضا ہے کہ ملت مسلمہ ان معاملات کے بارہ میں فوری طور پر اپنے کو صف آراء کرے اور اپنے وسائل و اسباب کو کماحقہ استعمال کرے۔ ان اہم اور فوری امور میں ایک انتہائی اہم مسئلہ قانونی' دستوری اور عدالتی معاملات کا ہے۔ اس میدان میں مغربی تصورات و افکار کے تسلط اور غلبہ نے ایک بڑے طبقہ کے ذہن کو متاثر بلکہ ماؤف کر دیا ہے کہ یہ طبقہ اسلام کے تصورات و نظریات کو سمجھنے میں اس طرح مشکل محسوس کرتا ہے جس طرح کوئی بھی مغربی دانشور۔ تاہم یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ دنیائے اسلام میں اس صورت حال کے خلاف ایک شدید رد عمل اٹھتا نظر آرہا ہے جو اگر مثبت اور تعمیری خطوط پر آگے بڑھا تو ایک بڑی خوشگوار تبدیلی کا ذریعہ بنے گا۔

اسی رد عمل کا مظہر وہ دلی آرزو ہے جو اسلام کے تصور عدل و احسان پر مبنی معاشرہ کے قیام اور اسلامی تصورات کے عملی نفاذ عالم اسلام کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں اٹھتی نظر آتی ہے۔ اسی آرزو کی تکمیل کے انتظار

میں آج لاکھوں گردنیں کٹ رہی ہیں' لاکھوں گھر اجڑ رہے ہیں' کتنے ہیں جو گھر سے بے گھر ہو رہے ہیں اور کروڑوں دل ہیں جو اس دیرینہ خواب کی تعبیر کی تمنا میں دھڑک رہے ہیں۔ لیکن اس خواب کی تعبیر اس قدر آسان نہیں ہے جتنا ہم میں سے بعض حضرات سمجھتے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر ایک طویل سفر کی متقاضی ہے۔ ایسا طویل سفر جس کی پہلی منزل' ایک فکری تبدیلی' ایک تعلیمی تحریک اور ایک ذہنی انقلاب سے عبارت ہے - جب تک اسلام کے تصورات و تعلیمات پر گہرا ایمان رکھنے والی' دور جدید میں ان کو روبہ عمل لانے کے جذبہ سے سرشار اور اس راہ کی مشکلات سے کلی طور پر آگاہی اور ادراک رکھنے والی نسل وجود میں نہیں آئے گی اس وقت تک اس خواب کو حقیقت کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔

اس پہلی منزل کا پہلا قدم اسلامی فقہ اور قانون کی کماحقہ تعلیم و تدریس اور اس سلسلہ میں ضروری مردان کار کی تیاری کا کام ہے۔ ایسے مردان کار جو اسلامی فقہ کو اس کے بنیادی مآخذ و مصادر سے براہ راست سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں' جن کو رائج الوقت قانونی' دستوری' اور عدالتی تصورات سے گہری لیکن ناقدانہ واقفیت حاصل ہو' جو شریعت کی حقانیت اور صلاحیت پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں اور دور جدید میں اس کی تعلیمات کو روبہ عمل لانے کا مومنانہ جذبہ رکھتے ہوں۔ ایسے افراد کی تیاری وقت کی وہ اہم ضرورت ہے جس کو ہماری ملی ترجیحات میں ابھی تک وہ جگہ حاصل نہیں ہوئی جو اس کو ہونی چاہیے تھی۔

بلاشبہ ہمارے بہت سے دینی اداروں اور اسلامی تعلیم کے مراکز میں فقہ کی تدریس و تحقیق کا کام ہو رہا ہے اور فقہی موضوعات پر کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ سب کچھ قطعاً" ناکافی ہے۔ اس تعلیم و تحقیق کا ہمارے قانونی نظام اور دستوری اداروں پر اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ وطن عزیز میں نفاذ اسلام کے کام میں پیش رفت نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی شریعہ اکیڈمی اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قائم کی گئی۔ اکیڈمی نے وکلاء اور ارکان عدلیہ کے تربیتی پروگراموں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ایک شعبہ قائم کیا جس کے تحت اردو اور انگریزی میں مختلف موضوعات پر جدید انداز سے اسلامی قوانین کے مختلف پہلوؤں پر کتابوں کی اشاعت کے ایک طویل المیعاد منصوبے کا آغاز کیا گیا ہے۔ تصنیف و تحقیق اور نشر و اشاعت کے اس طویل منصوبہ کے ساتھ ساتھ اکیڈمی نے آج سے چند سال قبل ایک شعبہ ایسا بھی قائم کیا جہاں فاصلاتی تعلیم کے اصولوں کے تحت فقہ اسلامی کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری یہ متواضعانہ پیش کش مقبول ہوئی اور اللہ رب العزت نے اپنی بے پایاں نعمت اور لامتناہی فضل سے ہماری اس کاوش کو کامیابی سے نوازا اور ہم تین سال کی مختصر مدت میں اس کورس کے ذریعہ پاکستان اور بیرون پاکستان کے کوئی ڈیڑھ ہزار افراد تک اسلامی قانون اور فقہ کی ایک مربوط اور جامع تصویر پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

زیر نظر کورس وکلاء، طلبہ قانون اور عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے ہے۔ اس کا دورانیہ ایک سال ہے اور یہ چوبیس اسباق یا یونٹوں پر مشتمل ہے جن میں فقہ اسلامی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ ہر سبق میں تدریسی مواد کے ساتھ ساتھ مزید مطالعہ کے لئے کتابوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

مطالعہ قانون اسلامی کے اس ابتدائی کورس کے بعد چار دوسرے کورس بھی تیار کرائے جارہے ہیں جو فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر ہیں۔ ہمارے ان "ایڈوانس کورسز" کی تیاری کا کام جاری ہے اور جلد ہی ہم ان کو بھی شروع کر دیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

اسلام میں قانون سازی کا تصور اور طریق کار

"اسلام میں قانون سازی کا تصور اور طریق کار" سلسلہ مطالعہ اسلامی قانون کا چھٹا یونٹ ہے۔ اس سے قبل کے پانچ یونٹوں میں اصول فقہ کے پانچ اساسی موضوعات کا تعارف کرایا جا چکا ہے جس کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قانون سازی کے عمل میں آنے والے دیگر مختلف مصادرو مراحل کا بھی ضروری اور مختصر تعارف کرایا جائے۔ قانون سازی سے متعلقہ موضوعات کی تفصیل اس قدر زیادہ اور ہمہ جہت ہے کہ ان مختصر صفحات میں اس سے انصاف کرنا ممکن نہیں ہے۔ مغربی سیاسیات کی لغت میں ماضی قریب کے برعکس قانون سازی اب صرف پارلیمنٹ ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ مقامی حکومتوں اور خود مختار اداروں تک میں اس کی ضرورت پیدا ہو چکی ہے۔ اس لئے ان شعبوں میں قانون سازی کے لئے بنیادی راہنما اصول وضع کرنا ضروری خیال کیا جانے لگا ہے۔

دور جدید میں اسلامی قانون سازی کے باب میں سب سے بنیادی چیز مسلمانوں کی اجتماعی خلافت کا تصور ہے۔ صرف اسی ایک موضوع پر ایک ضخیم کتاب مرتب کی جا سکتی ہے لیکن ہم نے تفصیلات سے احتراز کرتے ہوئے بنیادی مباحث ہی پر گفتگو کی ہے۔ تاہم مزید مطالعہ کے لئے کئی مفید کتب کے نام دے دیئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے بہتر معلومات کا حصول ممکن ہے۔ یونٹ میں قانون سازی کے بعض اہم لوازم کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جدید ریاستی تنظیم کے تینوں شعبوں مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے ذریعے کی جانے والی قانون

سازی میں اسلام کن باتوں پر زور دیتا ہے۔ وطن عزیز طویل عرصے تک استعمار کے زیر نگیں رہا اور اس عرصے میں غیر ملکی حکمرانوں کے قوانین بھی رائج ہوئے جن کا بڑا حصہ اب بھی ملکی قانون میں شامل ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ رائج الوقت ملکی قانون اور عرف وغیرہ کو بھی اس بحث میں جگہ دی جائے۔ یونٹ کا آخری حصہ اسی بارہ میں ہے۔

فقہ اسلامی میں قانون سازی کا مفہوم قانون سازی کے جدید مفہوم سے دو اعتبار سے قدرے مختلف رہا ہے۔ اولاً یہ کہ اسلامی قانون اپنے مزاج اور روح کے اعتبار سے ایک پرائیویٹ قانون ہے۔ لہٰذا ماضی میں مجتہدین نے اپنے اجتہادات اور فقہاء کی تالیفات ہی کی روشنی میں نئی قانون سازی کی اور اسی بنیاد پر قاضی حضرات عدالتوں میں فیصلے کرتے رہے۔ ثانیاً یہ کہ مسلمان قاضی کو کبھی کسی سرکاری طور پر مدون یا وضعی قانون کا پابند نہیں کیا گیا۔ بلکہ وہ اپنے دین و ایمان اور قلب و ضمیر کے مطابق پہلے شریعت اسلامی اور بعد کے ادوار میں فقہ کے احکام کی تعبیر و تشریح کر کے مسائل کا فیصلہ کرتا تھا۔ ان فیصلوں کی آخری بنیاد قرآن و سنت کی نصوص ہوتی تھیں۔ اس لئے مسلمان قاضی کے تقرر میں قرآن و سنت کا فہم ہی وہ بنیادی اہلیت تھی جو پیش نظر رکھی جاتی تھی۔

لیکن عہد جدید میں اس صورت حال میں کئی اعتبار سے تبدیلی آچکی ہے۔ مسلم ممالک میں استعماری طاقتوں کے قوانین ہی نہیں بلکہ دستوری اور قانونی ادارے اور سیاسی تصورات بھی اسی زور و شور سے موجود ہیں۔ ان حالات میں قاضی یا منصف کی بنیادی شرائط اہلیت بہت حد تک تبدیل ہو چکی ہیں۔ اس لیے وضعی قانون سے واقفیت بھی وقت کی اہم ضرورتوں میں سے ایک ضرورت بن گئی ہے جس پر ایک مسلمان قاضی کو انحصار کرنا پڑتا ہے۔

اکیڈمی امید کرتی ہے کہ قانون کے پیشے سے منسلک اصحاب علم اس کوشش کو پسند کریں گے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ ہمیں آپ کی آراء بھی حاصل ہوں گی۔

۵ / رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ
۱۵ / جنوری ۱۹۹۷ء

ڈاکٹر محمود احمد غازی
ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

کائنات کا اقتدار اعلیٰ

قانون سازی کسی بھی شکل میں ہو، سب سے پہلے یہ سمجھنا اہم ہے کہ اس کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے؟ اس کے بعد ہی انسان کا حق قانون سازی معلوم ہو سکتا ہے۔ کیا انسان اپنے افعال کے بارے میں مطلقاً مقتدر (Sovereign) ہے یا اس کا اقتدار مشروط ہے؟ کیا اس کے اختیارات اس کا لازمہ ہیں یا تفویض کردہ (Delegated) ہیں؟ کیا وہ مطلقاً آزاد ہے یا کسی کی منشا و مرضی کے تحت ہی حرکت و تغیر کی زد میں آتا ہے۔ ان سوالات کا جواب مل جانے پر اسلام میں قانون سازی اور اس کے حدود عمل کا جاننا سہل ہوتا ہے۔

قرآن و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمین اور اس کے وسائل ہی نہیں، آسمانوں، تمام ستاروں اور کائنات کی لامحدود وسعتوں اور اس کے معلوم و نامعلوم انتہائی گوشوں پر، صرف اور صرف اللہ کی فرماں روائی ہے۔ ان سب کی تخلیق، تنظیم، ترتیب، تدبیر اور تقدیر اللہ ہی کی رہین منت ہے اور ہر طرح کا اقتدار و تملک اسی کے تصرف میں ہے۔ قرآن میں اللہ کا ارشاد ہے۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی

اسی (اللہ) کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اور جو کچھ زمین کی تہہ میں ہے۔ (طٰہٰ، ۲۰:۶)

کائنات پر اللہ کا اقتدار و تملک ہی نہیں بلکہ اس کا نظام و بندوبست بھی وہی چلا رہا ہے، قرآن میں فرمایا:

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ۔ (سجدہ، ۳۲:۵)

آسمان سے زمین تک دنیا کا انتظام وہی کرتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ کائنات پر اقتدار اعلیٰ ہی نہیں حکومت بھی اسی کی ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بقرہ، ۲:۱۰۷)

کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔

اللہ کی حکومت دنیاوی تصور سے بالکل ہٹ کر ہے۔ جس میں عوام کی حکومت ان کے نمائندوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ وہ عوام کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ انہی کی رضامندی (Mandate) سے ان نمائندوں کو حکومت کرنے کا اختیار حاصل رہتا ہے۔ اللہ نہ کسی کو جواب دہ ہے اور نہ اس کی حکومت کسی کی رضامندی سے قائم ہے۔ اس کی

حکومت میں کسی کی شرکت نہیں ہے قرآن میں فرمایا:

وَلَمْ يَكُنْ لَّه شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ (فرقان ۲۵:۲)

اور بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

خود انسان روز مرہ زندگی میں مشاہدہ کرتا ہے کہ سورج ایک خاص وقت پر طلوع ہو کر معین راستے پر چلتا ہوا' منضبط انداز میں' اپنا سفر مکمل کرتا ہے۔ چاند انضباط کے ساتھ ازل سے کسی کا پابند نظر آرہا ہے۔ موسموں کی تبدیلی بھی ایک ترتیب سے ہوتی ہے' سمندر میں مدوجزر کے لگے بندھے قواعد ہیں۔ بارش' برف باری اور طوفان بھی بے لگام نہیں ہوتے۔ بلکہ گہرے مطالعے کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اللہ کی یہ منہ زور اور طاقتور قوتیں بھی کچھ خاص اسباب کی علامتیں ہوتی ہیں۔ انسان ان اسباب کا پتہ چلا لے تو ان قوتوں کے اظہار کا اندازہ قبل از وقت کیا جا سکتا ہے۔ ان اشیاء پر انسان کا عمل دخل بالکل نہیں ہے۔ آج تک کوئی انسان کسی سیارے کو اس کے محور سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ طلوع آفتاب کا وقت تبدیل کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

انسانی معاملات میں بھی اللہ کا اقتدار اعلیٰ ہر سو نظر آتا ہے۔ انسان کی پیدائش' کسی خاص علاقے' قبیلے اور خاندان میں پیدا ہونا' اللہ کی تدبیر سے ممکن ہے۔ اس کا حسب نسب اس کے اعزہ و اقارب کے کوائف اور حتیٰ کہ خود اس کے اپنے مزاج کی ترکیب میں انسان کا عمل دخل کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ یہ تمام شواہد اور مثالیں اللہ کے اقتدار کا کھلا ثبوت ہیں۔

انسان کا مرتبہ و مقام

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کائنات کی تمام قوتیں' مظاہر' اجرام فلکی اور دوسری علامتیں' صرف ایک ہستی کے لئے عدم سے وجود میں لائی گئی ہیں اور وہ ہستی انسان ہے۔ سورہ بقرہ میں آتا ہے کہ سب کچھ وجود میں لانے کے بعد اللہ نے اپنے اس ارادے کو ظاہر کیا کہ اب وہ اپنا نائب تخلیق کرنا چاہتا ہے جس کے لئے اس نے انسان کا انتخاب کیا ہے۔ فرمایا:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّى جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (بقرہ ۲:۳۰)

اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

انسان کی تخلیق کے بعد اسے کرہ ارض پر بھیجا گیا۔ یہاں پر انسان کی حیثیت اللہ کے نائب کی ہے۔ ہبوط آدم کے بعد کئی اشیاء اس کے تصرف میں دے دی گئیں۔ قرآن میں فرمایا:

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (یونس، ۱۰: ۱۴)

پھر ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا، تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

اللہ کی نیابت کو اصطلاح میں خلافت کہا گیا ہے۔ یہ خلافت مطلق ہے اور تمام انسان اللہ کے نائب ہیں۔ لیکن نیابت کے حصول کے لئے جو اہلیت درکار ہیں، سرکش، ظالم اور کفر کا ارتکاب کرنے والے افراد اور قومیں اس سے خالی ہوتے ہیں۔ اللہ جیسی بزرگ، برتر، غالب اور حکیم ہستی سے نسبت کے اہل وہی لوگ ہیں جو اس کے مقرر کئے ہوئے معیار پر پورا اترتے ہیں۔ اس کے دیئے ہوئے اختیارات اور قوتیں، اس کی دی گئی خود مختاری کی حدود میں رہتے ہوئے استعمال کرتے ہوں۔ جو لوگ سرکشی، ظلم، بغاوت اور کفر کا رویہ اختیار کریں، تفویض کردہ (Delegated) اختیارات کے دائرے سے نکل کر آئینی (Constitutional) خلاف ورزی کے مرتکب ہوں، وہ خلافت کے لئے نا اہل قرار دیئے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے انسانوں کی دو قسمیں ہیں اول الذکر افراد اللہ کے اطاعت گزار یعنی مومنین ہیں جبکہ دوسری طرح کے لوگ سرکش، باغی اور نافرمان ہونے کے باعث کافر کہلاتے ہیں۔ دونوں زمروں کو الگ الگ کرنے کے لئے اللہ نے انسان کو زمین پر کچھ اختیارات دے کر بھیجا ہے۔ قرآن میں آتا ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (اعراف، ۷: ۱۰)

اے انسانو! ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے اس میں ساماں زیست فراہم کئے۔

زمین میں اختیارات کے ساتھ بسانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ذہنی صلاحیت اور ساخت دوسری مخلوق سے الگ رکھی اور یہ اہتمام کیا کہ انسان دوسروں پر فوقیت رکھے۔ اس طرح نوع انسان کو خلافت ارضی دی، زمین کے وسائل اور خزانے اس کی تحویل میں دے دیئے، دوسری مخلوق اس کی مطیع اور فرمان بردار بنا کر اس کے حوالے کی اور انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا۔ پھر دنیا میں انسانوں کے پھیل جانے سے ایک تنظیم کی ضرورت ہوئی تو اسے خلافت کا نام دے کر اس کے معیار پر پورا اترنے والی قوم کو اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ اس طرح ثابت ہوا کہ یوں تو انسان

بحیثیت مجموعی اللہ کا خلیفہ ہے۔ لیکن مسند خلافت ان لوگوں کو نہیں ملتی جو اپنے آپ کو اس کے لئے نا اہل ثابت کریں۔ قرآن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں خلافت کئی اقوام کے پاس رہی اور جب تک کوئی خاص قوم یا کسی خاص علاقے کے لوگ اللہ کے مقرر کردہ معیار مطلوب پر پورے اترتے رہے' یہ ذمہ داری انہی کے پاس رہی ہے۔ قرآن میں آتا ہے:

وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (اعراف' ۷: ۶۹)

(اے قوم عاد) یاد کرو جب اللہ نے قوم نوح کے بعد تمہیں خلیفہ بنایا۔

قوم نوح کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ اس نے اپنے نبی کی مسلسل تکذیب اور نافرمانی کر کے اپنے آپ کو خلافت کا نااہل ثابت کر دیا۔ جس پر اللہ نے اس کی جگہ عاد نامی ایک دوسری قوم کو زمین کی خلافت عطا کی۔ اس قوم کے اندر بھی رفتہ رفتہ وہ برائیاں داخل ہو گئیں جن کے باعث قوم نوح کو تباہی کا سامان کرنا پڑا تھا۔ چنانچہ اس قوم کی جگہ اللہ نے ایک تیسری قوم ثمود' کو خلافت عطا کی۔ جب وہی برائیاں اس قوم میں بھی داخل ہوئیں' تو اللہ نے اس کا بھی وہی حشر کیا جو اس سے قبل کی قوموں کے ساتھ ہوا تھا۔ پھر بنی اسرائیل پر انعامات کی بارش ہوئی اور اب آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو خلافت ارضی کا اہل قرار دیا گیا۔

قرآن میں قوموں کے عروج و زوال کے جو اصول بیان ہوئے' ان سے پتہ چلتا ہے کہ کرہ ارض پر نسلی' علاقائی' گروہی' لسانی' قومی' کسی بھی اعتبار سے کوئی قوم یا فرد اللہ کا چہیتا نہیں رہا کہ ہر حال میں اللہ اسے عزیز رکھتا ہو بلکہ ہمیشہ مقرر کردہ حدود کی پاسداری کرتے رہنے ہی تک اللہ نے کسی خاص قوم کے ساتھ شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کیا۔ جب اس قوم نے حدود اللہ سے تجاوز کیا تو اسے ملیا میٹ کر کے کسی دوسری قوم کو موقع دیا گیا۔

اس سے ثابت ہے کہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۰ میں انسان کو دیے گئے اختیارات کی لازماً کچھ حدود ہیں۔ ان حدود کی پابندی ہی تک انسان اپنے اختیارات استعمال کرنے کا مجاز ہے۔

قانون سازی کے بنیادی اسلامی تصورات

اسلامی ریاست کو دیئے گئے اختیارات کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس وسیع کائنات کے ایک چھوٹے سے سیارے میں آباد مخلوق' اقتدار اعلیٰ کی مالک نہیں ہے' بلکہ اللہ نے بحیثیت مقتدر اعلیٰ اسے کچھ اختیارات دے کر زمین میں مبعوث کیا ہے۔ قانون سازی کرنے کے اختیارات میں دو بنیادی تصورات بطور خاص شامل ہیں۔

۱۔ اجتماعی حکومت کا تصور

پہلا اصول یہ ہے کہ اسلام کسی فرد کی حکومت کی بجائے تمام مسلمانوں کی اجتماعی حکومت قائم کرتا ہے جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے:

مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ

کسی بشر کا کام یہ نہیں ہے کہ اللہ تو اسے کتاب اور حکم اور نبوت سے سرفراز کرے، اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کی بجائے میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم ربانی بنو۔ (آل عمران، ۳:۷۹)

یہ اصول ہر طرح کی آمریت (Dictatorship) کی نفی کرتا ہے۔ اقتدار، قوت اور طاقت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس قوت اور طاقت کے بل بوتے پر کوئی حاکم انسانوں کو غلام بنائے۔ یا اپنی من مانی خواہشات کو بذریعہ قانون، لوگوں پر نافذ کرے تو یہ غلط ہے۔ اس آیت کا مطلب ایک دوسرے زاویئے سے لیا جائے تو اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ جہاں مقتدر کو اختیارات سے سرفراز کیا، وہاں عوام کو شخصی آزادیاں بھی دی ہیں کہ ان پر اول اول صرف اللہ کی اطاعت واجب ہے۔ حکمران کا کام یہ ہے کہ اس اطاعت کا اہتمام کرے۔ اس سے بڑھ کر کسی اولی الامر کی اطاعت صرف اس حد تک ہے کہ وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کروائے۔ باقی معاملات کے بارے میں نصوص قطعیہ میں بصراحت بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو کس حد تک آزادی دیتا ہے، اس آزادی کا استعمال فرد کیسے کرے، یہ فرد پر منحصر ہے۔ مثلاً مردوں کو کہا گیا کہ وہ اپنی بیویوں میں عدل کریں اور اگر انہیں اندیشہ ہو کہ وہ عدل قائم نہ کر سکیں گے تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کریں۔ یہ خطاب ایک مومن فرد سے ہے۔ اسے اس بارے میں مطلقاً آزادی دی گئی ہے کہ عدل کا اہتمام وہ خود کرے۔ ریاست کو فرد کی اس آزادی میں مزاحم ہونے کی کوئی اجازت قرآن و سنت کے عمیق ترین مطالعے سے بھی نہیں ملتی۔ لہٰذا کسی حکمران کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اللہ کی دی گئی اس آزادی کو محدود یا ختم کرے۔ رہا اس فرد کا معاملہ جس نے اپنی بیویوں کے درمیان عدل قائم نہ کیا، تو یہ اللہ اور بندے کا معاملہ ہے۔ اس باب میں کسی مجلس قانون ساز کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ ہاں نان نفقہ اور ضروریات زندگی کے معاملہ میں عدل نہ کرنے پر حاکم مداخلت کر سکتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ کون شخص کس قدر عدل کرتا ہے، اس کا

جواب اس فرد کے ذمہ ہے حاکم یا ریاست کے ذمہ نہیں۔

اطاعت امیر کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ معروف میں اطاعت کی جائے، نافرمانی نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کرنے والی عورتوں پر لازم ٹھہرایا کہ وہ معروف میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی۔ فرمایا:

وَلَا يَعْصِينَكَ فِىْ مَعْرُوْفٍ (الممتحنہ ۶۰: ۱۲)

اور کسی امر معروف میں آپ کی نافرمانی نہ کریں گی۔

معروف سے مراد عرف (Customary Law) ہے جو قرآن و سنت کے منافی نہ ہو۔ اس بارے میں قدرے تفصیل اس باب کے آخر میں دی گئی ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ امیر کا حکم پسند ہو یا ناپسند ہو، ہر دو صورتوں میں امیر کی اطاعت رعایا پر لازم ہے۔ اگر امیر کی اطاعت نہ کی جائے تو یہ معاشرے کے نظم کو برباد کرنے کے برابر ہے۔ اسلام اس کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔ یہاں تک امیر کی اطاعت مطلق اور بے تحدید ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔

السمع والطاعه علی المرء المسلم فیما احب و کره (۱)

(اپنے امیر کی) سمع و اطاعت مسلمان پر فرض ہے، خواہ (امیر کا حکم) اسے پسند ہو یا ناپسند۔

حدیث کے اگلے حصے میں اطاعت کے اس تصور کو محدود اور مقید کر دیا جس کے بعد امیر پر اشارتاً یہ پابندی عائد ہوئی کہ وہ غیر شرعی احکام صادر نہ کرے، اور رعایا کو بصراحت حکم دیا کہ برائی کے کاموں میں اطاعت ہرگز نہ کی جائے۔

مالم یومر بمعصیه، فاذا امر بمعصیه، فلا سمع وطاعه (۲)

جب تک اسے برائی کا حکم نہ دے اور جب گناہ کا حکم دیا جائے، تو کوئی سمع و اطاعت نہیں۔

اولی الامر کو رعایا پر دیئے گئے اختیارات بھی کچھ پابندیوں کے ساتھ ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور حکومت میں گشت کے دوران میں ایک گھر سے گانے بجانے کی آوازیں سنیں تو دیوار پھاند کر گھر کے اندر داخل ہو گئے اور

صاحب خانہ کو سرزنش کی۔ اس نے جواب میں کہا کہ امیرالمومنین مجھ سے ایک خطا سرزد ہوئی ہے۔ لیکن آپ نے تین غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ اول یہ کہ آپ نے میرے گھر کی چار دیواری کا احترام نہیں کیا' دوم آپ دروازہ کھٹکھٹا کر سامنے سے نہیں آئے اور سوم یہ کہ اللہ نے تجسّس سے منع کیا ہے' آپ تجسّس کے مرتکب ہوئے۔ امیرالمومنین حضرت عمرؓ نے اپنی غلطیوں کو تسلیم کیا۔ اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قانون نافذ کرنے کے لئے بھی اسلام نے کس قدر کڑی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ یہ پابندیاں یہ اشارہ بھی فراہم کر رہی ہیں کہ شخصی آزادی کی قیمت پر حکمران کے لئے اختیارات کا استعمال جائز نہیں۔

۲۔ رعایا سے اطاعت کا مطالبہ

دوسری طرف رعایا پر واجب ہے کہ وہ حاکم کے اختیارات کی اطاعت کرے۔ اس اطاعت کی حدود نصوص میں بتائی گئی ہیں۔ گزشتہ ابواب میں سورۃ نسا کی آیت ۵۹ کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے کہ مسلمانوں پر اولی الامر کی اطاعت ان کے اختیارات کی حد تک واجب ہے۔ مسلمانوں کا امیر کسی بھی نسلی' لسانی' قومی' وطنی یا علاقائی اکائی سے تعلق رکھتا ہو' اسلام اس سے بحث کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔ شکل صورت کے بارے میں بھی اسلام قطعاً" اجازت نہیں دیتا کہ کسی کے ظاہری حسن و قبح کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔ یہ سب عوامل اسلام کی نظر میں بے وقعت ہیں۔ انس بن مالکؓ سے مروی حدیث کے الفاظ ہیں۔

قال رسول اللہ اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیبۃ (۳)

رسول اللہ نے فرمایا کہ (اپنے امیر کی) بات سنو اور اطاعت کرو' چاہے تمہارا امیر ایسا حبشی غلام بنایا گیا ہو جس کا سر انگور کے خشک دانے جیسا ہو۔

خطبہ حجتہ الوداع کے خطاب میں یہ بات یوں دہرائی۔

اگر تم پر ناک کٹا سیاہ فام غلام بھی امیر مقرر کیا گیا ہو جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کر رہا ہو تو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔(۴)

ان دونوں حدیثوں میں حبشی غلام اور پھر ناک کٹے حبشی غلام کی اطاعت واجب قرار دے کر اطاعت کی انتہائی حد بتائی گئی ہے جس کے بعد کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ دنیا کے جدید فتنوں جیسے رنگ' نسل' وطن' زبان

یا علاقے کی حدود کے اندر کوئی خود کو مقید کرے اور ان کی بنا پر کسی احساس تفاخر یا احساس کمتری کا شکار رہے۔ یہ تمام تصورات جاہلانہ ہیں اور ان پر ایمان رکھنے والا اگر ناواقفیت کی وجہ سے کرتا ہے تو علم حاصل ہونے پر توبہ کرے۔ اور جانتے بوجھتے ایسے کرتا ہے تو اللہ کا باغی ہے۔ اور بہتر ہے کہ جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اپنا مقام اور مرتبہ مسلمانوں کی عالم گیر برادری سے باہر متعین کرے۔

قانون سازی کے لوازم

اسلامی تعلیمات کے یہ دو بنیادی تصورات مزید قانون سازی کے لئے راہ نمائی فراہم کرتے ہیں۔ ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور قرآن و سنت کے اندر رہتے ہوئے ہر عہد اور ہر علاقے میں نئی قانون سازی کی جا سکتی ہے جس کے لوازم درج ذیل ہیں۔

ا۔ مشاورت اور اس کے فوائد

اس میں شک نہیں کہ اللہ کی ہر تخلیق، بشمول انسان، حسن اور کمال کا شاہکار ہے۔ ہر دماغ، اللہ کی قدرت کا مظہر ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر انسان کو اللہ نے کچھ مخصوص صلاحیتیں اور توانائیاں دے رکھی ہیں۔ کوئی شخص زندگی کے کسی ایک میدان میں مہارت رکھتا ہے تو کوئی دوسرا زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر نظر رکھے ہوتا ہے۔ انسانی صلاحیتوں کے اسی تنوع سے معاشرے کی تشکیل عمل میں آتی ہے، تقسیم کار کا نظام معرض وجود میں آتا ہے اور یوں اجتماعی مسائل اجتماعی کوششوں سے حل ہوتے ہیں۔ فرد کو اس حد تک تو آزادی ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی کے فیصلے اپنے فہم اور شعور کے مطابق کرے۔ لیکن جب وہی شخص اجتماعی مسائل حل کرنے پر مامور ہوتا ہے تو یہ اصول بھی شامل ہو جاتا ہے کہ اس کی شخصی رائے کا احترام تو کیا جائے لیکن ایک شخص پر انحصار کرنے کی بجائے بہت سے افراد کو شامل کیا جائے۔ اس طریق کار سے دو اہم فوائد حاصل ہوتے ہیں اگرچہ باقی فوائد کے وجود سے انکار نہیں۔ یہ دو فوائد مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ اجتماعی ذمہ داری

پہلا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اجتماعی بحث و مشاورت کے نتیجے میں ہونے والے فیصلے کے بعد غلطی ظاہر ہونے پر ایک آدمی پر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی بلکہ بہت سے افراد اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں جن

میں وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جنہوں نے اس فیصلے سے اختلاف کیا ہو۔ اگر ایک آدمی فیصلہ کرنے کے بعد اسے نافذ کروائے تو غلط نتائج نکلنے پر تمام ذمہ داری اسی آدمی کی ہوتی ہے۔ جب کہ مشورے کی صورت میں ممکن ہے' وہی رائے باقی لوگوں کی بھی ہو۔ اگر اکیلا آدمی فیصلہ کرے تو ویسی ہی رائے رکھنے والے باقی افراد بھی اس کا محاسبہ کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ لیکن خود ہی رائے دے کر وہ غلط نتائج میں ذمہ دار بھی ہو جاتے ہیں۔ اس طرح تمام افراد اجتماعی طور پر فیصلے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

مشاورت کا تصور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ماخوذ ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ غزوہ بدر کے بعد جنگی قیدیوں کے بارے میں آپؐ نے باقی صحابہ کرام سے مشورہ مانگا۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو اپنے اصحاب سے مشورہ لیتے نہیں دیکھا(۵)۔

دوسری طرف مشورہ دینے والے پر بھی بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ترمذی ہی کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان المستشار مؤتمن (۴)

بے شک وہ امین ہے جس سے مشورہ طلب کیا جائے۔

مشورہ کی اہمیت اس حدیث میں بہت موثر اور بلیغ انداز میں ملتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب تمہارے کام آپس کے مشورہ سے ہوں تو زمین کی پیٹھ تمہارے لئے بہتر ہے۔ (یعنی تمہارا بحیثیت قوم زندہ رہنا مفید ہے) لیکن جب اس کے برعکس تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں تو زمین کا پیٹ تمہارے لئے بہتر ہے۔ یعنی پھر تم قبروں میں چلے جاؤ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے (۷)۔

صحابہ کرام کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کامیابی کی یہ کلید ہر معاملے میں اپنے پیش نظر رکھی اور کبھی اس سے بے نیاز نہ ہوئے۔ یہی خلافت راشدہ کا طرہ امتیاز رہا۔ تمام خلفائے راشد امور سلطنت صحابہ کے باہم مشورے ہی سے چلاتے رہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔

لا خلافة الا عن مشورة (۸)

مشورے کے بغیر کوئی خلافت نہیں

ب۔ مکمل معلومات کا حصول

باہم مشاورت کا دوسرا فائدہ اس سے کہیں زیادہ اہم اور قیمتی ہے۔ بحث و تمحیص کے بعد زیر بحث معاملے کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ اس طرح مجموعی شکل میں ایسی معلومات سامنے آتی ہیں جو فرداً فرداً ہر شخص کے علم میں نہیں ہوتی۔ اگر وہی فیصلہ فرد واحد سے صادر ہوتا تو خلوص اور نیک نیتی کے باوجود کئی اہم گوشوں کا احاطہ نہ کرتا جس کا نتیجہ سوائے نقصان اور شرمندگی نہ ہوتا۔ مکمل معلومات ہونے کی وجہ سے فیصلے کے درست ہونے کے امکانات کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔

اسلامی ریاست کے سیاسی نظام میں شورائی نظام اس کا اساسی ادارہ ہے۔ یہی وہ ادارہ ہے جو مسلمانوں کو شریک اقتدار ہونے کا تصور فراہم کرتا ہے۔ اس سے ہٹ کر کئے گئے تمام اقدام اسلامی تعلیمات کی نفی ہیں۔ قرآن میں اس کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ رسول اللہ کو خطاب کرتے ہوئے اللہ فرماتے ہیں۔

وشاورھم فی الامر (آل عمران ۳:۱۵۹)

(اے نبی) معاملات میں ان کو (اپنے ساتھیوں کو) بھی شریک مشورہ رکھو۔

مشاورت کے لوازم

مشاورت کا ادارہ بے تحدید نہیں، تعلیمات اسلامیہ اس کے لئے زرّیں قواعد فراہم کرتی ہیں۔ قرآن و سنت کے مطالعے سے مشاورت کے کچھ زریں اصول ملتے ہیں جو قانون سازی کے لئے بہترین راہ نمائی فراہم کرتے ہیں۔ ان تعلیمات کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

ا۔ اختلاف رائے کے حق کا احترام

جو فرد یا ادارہ کسی سے مشورہ طلب کر رہا ہو، اسے چاہیے کہ مشورہ دینے والے کو مکمل آزادانہ فضا فراہم کرے تاکہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق رائے کا اظہار کرے۔ جدید دنیا کی اصطلاح میں یہ تصور تحریر و تقریر کی آزادی سے ملتا جلتا ہے۔ مشورہ دینے والے کا فرض ہے کہ وہ تمام ڈر، خوف، لالچ اور ترغیب سے بے نیاز ہو کر مشورہ دے۔ اسے ایسا کرنے کے لئے حکم بھی دیا گیا ہے قرآن میں آتا ہے:

ومن اظلم ممن کتم شھادۃ عندہ من اللہ (بقرہ ۲:۱۴۰)

اور اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جس کے ذمہ اللہ کی طرف سے
ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔

حدیث کے الفاظ کے مطابق تو یہاں تک کہہ دیا گیا کہ اصحاب رائے سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلے کے پابند رہو۔ خلفائے راشدین کی سیرت اور طرز حکومت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اختلاف رائے برداشت کرتے تھے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اپنی ذات کو اجتماعی احتساب کے لئے مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور حکومت میں ایک مرتبہ خطبہ جمعہ کے دوران میں حکومتی فرمان جاری کیا کہ آئندہ کوئی شخص چار سو درہم سے زائد مالیت کا مہر مقرر نہ کیا کرے۔ اس دور میں جمعہ کا اجتماع کثیرالتقاصد ہوا کرتا تھا جس میں لوگوں کی شکایات سن کر امیر موقع پر احکامات صادر کرتا' ان سے مشورے طلب کرتا۔ یہ اعلان بھی گویا مشورہ کے لئے عام لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ سننا تھا کہ ایک عورت نے فوراً اعتراض کیا کہ قرآن تو عورتوں کو ڈھیروں مال (قنطار) دینے کی اجازت دیتا ہے تم کون ہوتے ہو مال کی حد مقرر کرنے والے؟ یہ سوال سنتے ہی حضرت عمرؓ نے سر جھکا کر اپنی رائے بدل ڈالی(۹)۔

ب۔ اہل ترین افراد کا انتخاب

عصر حاضر میں مشاورت کے لئے اہل افراد کا انتخاب صرف اسی ایک غرض کے لئے نہیں ہوتا۔ اس لئے اہل ترین افراد کے انتخاب کی ذیل میں سربراہ مملکت' سربراہ حکومت' کابینہ کے ارکان اور مجلس قانون ساز کے افراد بھی شامل ہیں۔ ان سب کے انتخاب میں قرآن و سنت کے احکام صریح ہیں۔ پہلا حکم یہ ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (حجرات' ۴۹: ۱۳)

بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ متقی' لائق تکریم ہے۔

تقویٰ' اللہ کے معیار مطلوب کی صفت کمال ہے۔ اس آیت کے پہلے الفاظ میں قبائل اور خاندانوں کی تقسیم کو قرآن بلا شبہ تسلیم کرتا ہے لیکن ان کی تکوینی علامت بھی ساتھ ہی بتا دی کہ یہ معاشرے کی تنظیم میں انسانوں کی پہچان کے لئے ہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑھ کر لائق

تکریم متقی شخص ہے۔

اولی الامر کے انتخاب یں دوسری شرط یہ ہے کہ کوئی شخص از خود کوئی منصب نہ طلب کرے۔ خود منصب طلب کرنے والا اس انتخاب کے لئے نااہل قرار پایا جائے۔ حدیث میں آتا ہے۔

انا لا نولی هذا من ماله ولا من حرص علیه (۱۰)

ہم اس کو حاکم نہیں بنائیں گے جو اس کی (حکومت) درخواست کرے یا اس کا حریص ہو۔

ج ۔ انفرادی آراء پر اجتماعی آراء کی فوقیت

کسی معاملے میں مجلس مشاورت کے شرکاء بلحاظ مرتبہ کم و بیش ہو سکتے ہیں۔ کوئی شخص اس مجلس کا یا مجلس قانون ساز کی صورت میں اس کا محض رکن ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی دوسرا فرد کسی اہم مجلس (Committee) کا رکن (Member) یا صدر نشین (Chairman) ہو۔ کوئی فرد وزارت کے منصب پر فائز بھی ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ انہی افراد میں سے ایک وزیراعظم ہوتا ہے۔ کسی زیر بحث معاملہ میں ممکن ہے، ایوان یا مجلس کی اکثریت ایک رائے رکھتی ہو، اور اقلیت میں کوئی وزیر یا اعلیٰ منصب کا حامل فرد ہو۔ ایسی صورت میں اس پر لازم ہے کہ اپنی انفرادی رائے سے دستبردار ہو کر اکثریت کے ساتھ چلے۔ یہ مسئلہ کسی صاحب مرتبہ کے ساتھ ہی نہیں کسی دوسرے رکن کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔ للذا اپنی رائے ہی کو درست قرار دینا مفید نہیں ہے بلکہ بہتر یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کے احترام میں اپنی ذاتی رائے چھوڑ دے۔ کسی موقع پر کوئی اپنی رائے کو ریکارڈ پر لانا ضروری خیال کرے تو بھی درست ہے۔ لیکن فیصلہ ہو جانے کے بعد تنفیذ کے مرحلہ میں اسے اجتماعی رائے کے حق ہی میں رہنا چاہیے۔ کسی بھی موقع پر یہ اظہار نہ کرے کہ میں نے تو یوں مشورہ دیا تھا، یا میری رائے یہ تھی جس کے دلائل یہ ہیں، غلط رویہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مذکورہ فرد بھی اسی ایوان کا حصہ ہوتا ہے۔ جس نے اس کی رائے کے برعکس فیصلہ کیا ہے۔ فنی لحاظ سے اس فرد کی رائے اب سب کا فیصلہ بن چکی ہے۔ جس کی مخالفت کرنا، خود اپنی مخالفت کرنا ہے۔ یہ رویہ سب کو کمزور کرتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے۔

وَلَاتَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (انفال ۸: ۴۶)

اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر سے کام لو۔ یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

د۔ عزم صمیم اور اللہ پر توکل

جب مشاورت کے یہ لوازم پورے ہو جائیں' شرعی طریقے سے شوریٰ کا انعقاد ہو جائے' اور شوریٰ باہم کسی اجتماعی رائے پر پہنچ جائے تو پھر اس رائے پر ڈٹ جانا چاہیے۔ تمام ناگزیر وسائل اس فیصلے کی تنفیذ کے لئے استعمال کئے جائیں۔ اب تردد کا عنصر بالکل ختم کر دیا جانا چاہیے۔ یہ سوچنا کہ فیصلہ تو ہو چکا ہے' اب اس پر عمل کیسے ہو گا' یا خبر نہیں لوگ اس فیصلے کو قبول کریں' نہ کریں یا اس فیصلے کا یہ نقصان ہو گا' یہ سب غلط باتیں ہیں۔ یہ تمام امکانات فیصلے سے قبل زیر بحث لائے جائیں۔ بے یقینی کی کیفیت اچھے اور درست فیصلے کو بھی گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ اس لئے بے یقینی کو ختم کر کے عزم صمیم کے ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا جانا چاہیے۔

عزم صمیم کے ساتھ اللہ پر توکل بھی بڑا ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شوریٰ کا غیر متزلزل ایمان ہو کہ ہم سب نے پوری دیانت داری اور خشیت الٰہی کے ساتھ فیصلہ کیا ہے' اس کے نتائج کچھ بھی ہوں' اللہ ہی ہماری نصرت و راہ نمائی کرنے والا ہے۔ مثبت نتائج ظاہر ہوئے تو فکر کی چنداں حاجت نہیں' اور دوسری صورت میں بھی اللہ ہی کارساز ہے۔ کیوں کہ شوریٰ کے تمام افراد نے مقدور بھر کوشش کی کہ درست رائے ہی سامنے آئے۔

عزم صمیم اور توکل کے اس تصور کے بارے میں قرآن کریم سے ہمیں یوں راہ نمائی ملتی ہے۔ قرآن میں آتا ہے۔

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (آل عمران' ۳:۱۵۹)

پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو' بے شک اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔

و۔ احکام الٰہی کی پابندی اور ملکی دستور

جدید ریاستوں میں برطانیہ کے سوا تقریباً ہر ملک کا تحریری دستور موجود ہے جس میں ریاست کا انتظام

و انصرام چلانے کے لئے اصول درج ہوتے ہیں۔ یہی دستوری اصول بعد میں ہونے والی قانون سازی کے لئے روشنی فراہم کرتے ہیں۔ کسی بھی ریاست کی مقننہ کوئی ایسا قانون منظور کرنے کی مجاز نہیں ہوتی جو ملک کے دستور سے متصادم ہو۔ اگر کسی وجہ سے ایسا کوئی قانون منظور ہو بھی جائے تو بالغ النظر شہری عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے اس قانون کو کالعدم کروا دیتے ہیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ دستور کسی بھی ملک کا وہ منبع اور سرچشمہ قانون ہوتا ہے جس کی مدد سے قانون سازی کی جاتی ہے۔ ہر ریاست کے تمام اعضا کا یہ فرض ہوتا ہے کہ دستوری پابندیوں کو قبول کریں اور انہی کی روشنی میں نظم مملکت چلائیں۔

اسلام کا قانون سازی کا نظام اس تصور سے ذرہ برابر مختلف نہیں ہے۔ جدید ریاستوں میں قانون سازی اگر کسی تحریری دستور سے راہ نمائی حاصل کرنے کے بعد ہوتی ہے تو اسلامی قانون سازی میں یہ راہ نمائی قرآن و سنت سے حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح کسی ملک کا دستور اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس سے متصادم کوئی قانون وضع کیا جائے' بعینہٖ قرآن و سنت بھی مسلمانوں کو اپنی تعلیمات سے ہٹ کر کوئی قانون بنانے کی اجازت نہیں دیتے۔ کسی ملک کے دستور سے متصادم قوانین مختلف ذرائع سے کالعدم قرار دیے جا سکتے ہیں تو قرآن و سنت سے متصادم ریاستی احکام بھی امت کے اجتماعی ضمیر کے نزدیک باطل ہوتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن و سنت کو اسلامی ریاست کا دستور (Constitution) کہا جائے یا اس کے لئے کوئی اور نام یا اصطلاح وضع کی جائے' جدید زبان میں یہی اسلامی ریاست کے اصل الاصول ہو سکتے ہیں۔ جن سے متصادم تمام ریاستی احکام' قوانین اور عدالتی فیصلے کالعدم ہوتے ہیں۔ اس بات کو قرآن یوں بیان کرتا ہے۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (مائدہ' ۵:۴۵)

اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

سورۃ مائدہ ہی میں فرمایا:

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (مائدہ' ۵:۴۷)

اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔

اللہ کے حکم کے خلاف فیصلہ تین طرح سے ممکن ہے۔

اولاً" یہ کہ صریح الٰہی حکم کے خلاف کسی ریاست کی مقنّنہ کوئی قانون وضع کرے۔ جیسے اسلام کے عائلی نظام میں طلاق کا ایک سادہ، آسان اور سہل طریقہ بتایا گیا ہے۔ اس سے متصادم و منافی طریقہ وضع کرنے کا مطلب اللہ کے احکام پامال کرنے کے مترادف ہے اور ایسا کرنا مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں ظلم اور فسق ہے۔ ایسے قوانین کاغذ کی زینت تو بن سکتے ہیں امت انہیں قبول نہیں کرتی۔

اللہ کے نازل کردہ فرامین کے خلاف فیصلہ کرنے کی ایک شکل انتظامیہ سے متعلق ہو سکتی ہے۔ اس کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک واضح الٰہی احکام کے برعکس انتظامی فیصلے کرنا ہے۔ جیسے قرآن میں آتا ہے کہ جمعہ کی اذان ہونے پر تمام کاروبار بند کر دیا جائے۔ اس حکم کا ایک مقصد نماز جمعہ کی اہمیت بیان کرنا ہے تاکہ اذان کے بعد تمام کاروبار حیات رک جائے اور ایک خالص اسلامی تمدن وجود میں آئے۔ جمعہ کی نماز محض عبادت ہی نہیں بلکہ اسلامی تمدن کا ایک اہم عنصر بھی ہے۔ جس کے ذریعے اسلامی ثقافت کے مظاہر فروغ پاتے ہیں اور یوں اجتماعی زندگی فروغ پاتی ہے۔

اس قرآنی حکم کے برعکس مسلمانوں کی کوئی حکومت عین نماز جمعہ کے وقت تقریبات کا انعقاد کرتی ہے، کھیل تماشے جاری رکھتی ہے، ٹیلی ویژن پر پرکشش نشریات شروع کر دیتی ہے یا کوئی بھی ایسا عمل سر انجام دیتی ہے جس کی وجہ سے عام مسلمانوں کی رغبت نماز جمعہ سے کم ہو کر دوسرے مشاغل کی طرف مبذول ہو جائے تو مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں ان سب افعال کا اہتمام کرنے والے فاسق، ظالم اور کافر حکمران ہیں۔ کیونکہ یہ افعال سر انجام دینے والے حکمران اسلامی معاشرے میں بگاڑ پیدا کرنے والی قوتوں کے مددگار اور ترجمان تو ہو سکتے ہیں اسلام کے نہیں۔

اللہ کے نازل کردہ فرامین کے برعکس انتظامی فیصلہ کرنے کی دوسری صورت، فرائض میں کوتاہی ہو سکتی ہے۔ پولیس کا کام لوگوں کے جان و مال کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ اگر وہ اس فرض کو ادا کرنے میں ناکام ہوتی ہے۔ اور امن و امان کی صورت حال اس قدر بگڑ جائے کہ لوگ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کریں، تو یہ انتظامی ظلم، کفر اور فسق ہے۔

اللہ کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کرنے کی تیسری صورت عدالتی کارروائی کے ذریعے ہو سکتی

ہے- ہر وہ عدالتی فیصلہ جو قرآن و سنت کے احکام سے متصادم ہو یا ان کے منشا کے مطابق نہ ہو، ظلم کے مترادف ہے- ان تینوں ریاستی شعبوں کے بارے میں تفصیل آگے آرہی ہے-

اسلام کا نظام قانون سازی

شریعت کے اصول سامنے رکھتے ہوئے جدید اسلامی ریاست کے تینوں اجزاء اپنے اپنے شعبوں میں قانون سازی کے مجاز ہیں جس کا دائرہ کار کچھ اس طرح ہے-

۱- مقنّنہ کے ذریعے قانون سازی

کسی ملک کی مجلس قانون ساز کوئی قانون منظور کرنے کے بعد اس کی تنفیذ (Implementation) کے لئے انتظامیہ (Executive) کو مختار بنا دیتی ہے- مجلس قانون ساز کے پیش نظر جو کچھ بھی رہا ہوتا ہے اس کی روح (Spirit) کو قانون (Act) کے الفاظ میں سمو دیا جاتا ہے- رہا تنفیذ کا عمل تو اس کے لئے مجلس، انتظامیہ کو قواعد (Rules) وضع کرنے کا اختیار دے دیتی ہے-

اسلامی نظام میں ریاست کی مقنّنہ، قرآن و سنت کے احکام کی تنفیذ کے لئے قوانین وضع کرتی ہے- یہ مجلس قانون ساز کا پہلا وظیفہ (Function) ہے- مقنّنہ کا کام یہ ہے کہ قرآن و سنت کے واضح احکام کو رائج کرنے کے لئے مناسب لوازم کا اہتمام کرے- ان احکام کو نافذ کرنے کے لئے مجلس مناسب قانون سازی کر سکتی ہے- اسے چاہے آئینی تبدیلی کا نام دیا جائے اور چاہے اس کے لئے ایکٹ (Act) یا قواعد (Rules) کی اصطلاحات استعمال کی جائیں، مقصد بہرحال قرآن و سنت کے احکام کی تنفیذ ہے- یہ مجلس قانون کا پہلا کام ہے-

اسی طرح قرآن و سنت کے بعض احکام کی ایک سے زائد تشریحات ممکن ہیں- یہ اتفاقی امر نہیں ہے بلکہ خود اللہ حکیم نے انسانوں کے لئے اس لچک کا اہتمام کیا ہے- یہ تشریحات تبدیل شدہ ظروف اور پیمانوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں- اسلامی ریاست کی مجلس قانون ساز کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ تدبر اور غور کے بعد یہ متعین کرے کہ قرآن و سنت کی کون سی تشریح ملکی حالات کے مطابق ہے- اس تعین کے ساتھ مناسب قانون سازی بہ آسانی کی جا سکتی ہے-

مقنّنہ کی یہ دوسری ذمہ داری ہے-

اس سے خود بخود یہ مفہوم بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مجلس قانون ساز کے افراد، قرآن و سنت کے احکام کو سمجھنے کی

بصیرت سے مالا مال ہوں۔ لیکن چونکہ ایسا ہونا فی الوقت مشکل ہے اس لئے عبوری دور کے لئے قانون سازی کا جدید طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ جس میں مسودہ قانون کو ماہرین قانون (بشمول ماہرین فقہ اسلامی) پر مشتمل متعلقہ مجلس قائمہ (Standing Committee) کے سپرد کیا جاتا ہے جو اپنی سفارشات کے ساتھ اسے مجلس کے سامنے دوبارہ پیش کرتی ہے۔

قران و سنت بعض معاملات میں خاموش ہیں لیکن امت ان میں سے بعض معاملات سے کسی نہ کسی زمانے دوچار ہو چکی ہوتی ہے۔ ایسے مسائل اجتہاد (قیاس) اور اجماع کے ذریعے حل ہو چکے ہیں۔ اسلامی ریاست کی مجلس قانون ساز اس بات کی مجاز ہے کہ ایسے اجماعی مسائل کو زیر بحث لائے اور گزشتہ اجماعی آراء اور فقہاء کی بحثوں کی روشنی میں کوئی نیا قانون وضع کرے جو قرآن و سنت کی تعلیمات کے منافی نہ ہو۔

یہ مجلس قانون ساز کا تیسرا کام ہے۔

کسی زمانے میں مجلس قانون ساز کے سامنے بالکل نئے معاملات بھی آسکتے ہیں جن کی کوئی نظیر (Precedent) پہلے نہ ملتی ہو۔ ایسی صورت میں مجلس کو از خود نئے قوانین وضع کرنے کا اختیار ہے بشرطیکہ یہ قوانین اسلامی تعلیمات اور مقاصد شریعہ سے متصادم (۱۲) نہ ہوں۔ یہ کام صرف بذریعہ اجماع ہی ممکن ہے جس پر تفصیلی بحث تیسرے باب میں کی جا چکی ہے۔

۲۔ انتظامیہ کے ذریعے قانون سازی

جدید ریاستی تنظیم میں انتظامیہ بہت سے امور میں قانون سازی اور عدالتی کارروائی کے اختیارات بھی رکھتی ہے۔ مثلاً عدالتی کارروائی کے حوالے سے سرکاری ملازمین کی کارکردگی (Efficiency) اور انضباط (Discipline) کے قواعد (Rules) کے تحت انہیں مناسب سزا دے سکتی ہے۔ ان کی ملازمت ختم کر سکتی ہے۔ کم تولنے والے دکانداروں کو بااختیار افسر موقع پر جرمانے کر سکتے ہیں۔ محصول چونگی ادا نہ کرنے والوں کو جرمانے کرنے کے اختیارات بھی انتظامیہ اپنے پاس رکھتی ہے۔

کئی میدانوں میں انتظامیہ قانون وضع کرنے کے اختیارات بھی رکھتی ہے۔ جیسے ملازمین کی تنخواہ اور دوسرے الاؤنس اور مراعات کا تعین وغیرہ۔ انتظامیہ بعض عوامی نوعیت کے امور میں بھی قانون وضع کرتی ہے جو عام طور پر قواعد و ضوابط (Rules and Regulations) کی ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً درآمد برآمد سے متعلق پالیسی وضع کرنا،

درآمدی و برآمدی اشیاء پر ٹیکس لگانا' مختلف سرکاری خدمات جیسے بجلی' گیس' ٹیلی فون اور پانی مہیا کرنے کے بارے میں طریق کار وضع کرنا' قانون سازی ہی کی مثالیں ہیں۔

قانون سازی کی ایک اور قسم بھی انتظامیہ کے پاس ہوتی ہے جس کے مطابق انتظامیہ کسی علاقے کو کچھ وجوہ کی بنا پر آفت زدہ یا پس ماندہ قرار دے کر وہاں کے لوگوں کو کچھ مراعات دے سکتی ہے۔ کسی علاقے کو ٹیکس فری زون قرار دے کر وہاں کاروبار یا صنعت کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

انتظامیہ (Executive) کے ذریعے قانون سازی کے اختیارات کی یہ چند مثالیں ہیں جن کو ذکر کرنے کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ انتظامیہ بھی بعض میدانوں میں قانون سازی کے اختیارات رکھتی ہے۔ اسلامی ریاست کی انتظامیہ جب قانون سازی کے ان اختیارات کو استعمال کرتی ہے تو اس کے پیش نظر قرآن و سنت کے احکام ہوتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا:

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِنْ رَّبِّکُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖ اَوْلِیَآءَ

پیروی کرو اس چیز کی جو تمہاری طرف نازل کی گئی تمہارے رب کی طرف سے اور اسے چھوڑ کر دوسرے کی پیروی نہ کرو۔ (اعراف' ۷: ۳)

یعنی تمام انتظامی اختیارات استعمال کرنے سے قبل اللہ کے احکام پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اللہ کے احکام کے ہوتے ہوئے کسی اور کی پیروی کرنا سراسر ظلم ہے۔ دوسروں کی پیروی سے مراد اس شے کا اتباع ہے جو اللہ کے بالمقابل ہو۔ یہ شے اسلام کے مقابلے میں جدید نظام سرمایہ داری بھی ہو سکتا ہے' یہ اشتراکی نظام بھی ہو سکتا ہے اور یہ دوسرے گمراہ کن سیاسی فلسفے بھی ہو سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ بگڑے ہوئے حکمرانوں کے شخصی میلانات بھی ہو سکتے ہیں۔ جو بالآخر چور دروازہ سے قانون کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ سب اللہ کی حاکمیت کے مقابلے میں ہیں۔ ان میں سے کسی کی بھی اتباع کرنے کا مطلب حدود اللہ کو توڑنا ہے۔

قانون سازی میں یہ سامنے رکھنا ضروری ہے کہ جب ریاست اور فرد کے حقوق میں سے کسی ایک کا انتخاب مقصود ہو تو حدود اللہ کا خیال رکھتے ہوئے' یہ کوشش کی جائے کہ فرد کو اولیت حاصل رہے کیونکہ ریاست کا ایک مقصد وجود فرد کے حقوق کا تحفظ کرنا بھی ہے۔ اس لئے جہاں کہیں اشتباہ پیدا ہو جائے یا دونوں کے حقوق میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو دوسرے شرعی مقاصد کو متاثر کئے بغیر اور کسی اصولی تبدیلی کے بغیر' فرد کے حقوق کو

ترجیح دی جائے۔ فرد کے حقوق کا تحفظ شریعت اسلامی میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں سے حدود رفع کرنے کی کوشش کرو(۱۳)۔ فرمایا کہ قاضی کی غلطی خطا کار کے بخشنے میں ہو تو زیادہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کرے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا قانون اپنے شہریوں کے لئے قہر و غضب کی علامت نہیں بلکہ انہیں آزادانہ فضا میں رہنے کا ماحول مہیا کرتا ہے جس میں ریاست کا وجود شہریوں کے لئے ہے نہ کہ شہریوں کا وجود ریاست کے لئے ہے۔

عدلیہ کے ذریعے قانون سازی

جدید دور کی ریاست میں عدلیہ بھی کئی میدانوں میں قانون سازی کا فرض انجام دیتی ہے' مثلاً دستوری شعبوں میں ابہام ہونے کی صورت میں ان کی تشریح عدلیہ کا فرض اولین ہے۔ دستوری تقاضوں کے مطابق بنائے گئے کسی قانون کی آئینی حیثیت کو اگر عدالت میں لایا جائے تو بھی عدلیہ کی ذمہ داری ہے کہ اس قانون کی آئینی حیثیت کا تعین کرے۔ اگر دستور کے مطابق ہو تو عدالتی فیصلے کے ذریعے اسے برقرار رکھے۔ دوسری صورت میں ایسے قانون کالعدم قرار دیئے جاتے ہیں۔ مشورہ طلب کرنے پر ملک کی عدالت عظمیٰ حکومت کی معاون و مشیر بھی ہوتی ہے۔ بعض ملکوں میں اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے لئے ضابطہ اخلاق مرتب کرنے کے لئے مختلف ناموں سے کوئی نہ کوئی ادارہ بھی موجود ہوتا ہے۔ جیسے پاکستان میں سپریم جوڈیشل کونسل عدلیہ کے ارکان پر مشتمل ایک ادارہ ہے(۱۴) جو عدلیہ کے معزز ارکان کے رویوں کے بارے میں ضابطہ اخلاق مرتب کرتا ہے۔ یہ قانون سازی ہی کی ایک شکل ہے۔ عدالتیں کئی ایسے معاملات کی نشان دہی کرتی ہیں جن میں ملکی قانون خاموش ہوتا ہے۔ لاتعداد معاملات میں قانون کے خشک اور بے جان الفاظ روزمرہ کے معاملات میں بے بس ہوتے ہیں۔ چنانچہ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی تشریح ماتحت عدالتوں کے لئے آئندہ کے لئے بطور نظیر (Precedent) کام آتی ہے جو قانون سازی ہی کی ایک شکل ہے۔ یہ تمام شکلیں کسی نہ کسی پہلو سے قانون سازی ہی کی مختلف صورتیں ہیں جو ہر ملک میں اس کے دستور کے مطابق کم و بیش ہو سکتی ہیں۔

اسلام کا نظام قانون نہ تو فنی اصطلاحات سے بحث کرتا ہے اور نہ اسے اس بات سے دلچسپی ہے کہ ریاستی تنظیم کن ناموں سے قائم ہے۔ عدلیہ کے معزز ارکان کو جج کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یا منصف یا قاضی کہا جائے۔

کسی ملک کے ارباب حل و عقد کے مجموعہ کو مجلس شوریٰ کہا جائے یا اسے پارلیمنٹ کا نام دیا جائے' یہ سب انتظامی اور اصطلاحی تقسیم ہے۔ اسلام کا نظام قانون اس حد تک ناموں یا اصطلاحات سے کوئی سروکار نہیں رکھتا بلکہ اس کے پیش نظر کچھ اصول ہیں جو عدلیہ کے پیش نظر رہنے چاہئیں۔ یہی اسلامی نظام عدل ہے۔ اسے "قانون سازی" کا نام دیجئے یا "عدالتی تشریح" کے نام سے پکاریئے یا کوئی نئی اصطلاح وضع کر لیجئے لیکن اصول یہی ہیں۔

عدلیہ کے لئے اسلام میں پہلا اصول بہت واضح اور جلی ہے۔ یہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے اس کی ایک سے زیادہ تشریح و تعبیر ناممکن ہے۔ چاہے بات کو کتنا ہی توڑ موڑ کر ادھر ادھر کے دلائل جمع کر لئے جائیں۔ سیدھی سادھی بات کے مقابلہ میں تمام باتیں بے کار ہیں۔ یہ اصول ان الفاظ میں ہے:

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (مائدہ ۵:۴۵)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ (قانون) کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

ظالم' عادل کا متضاد (Antonym) ہے۔ ظلم کی تعریف عربی میں یوں ہے۔

وضع شی فی غیر موضعہٖ (۱۵)

کسی شے کو اس کے اپنے مقام سے ہٹانا

عدل کی تعریف یوں ہے۔

الحکم بالحق' ضد الجور (۱۶)

حق کے ساتھ فیصلہ کرنا۔ ظلم کا متضاد

لہٰذا یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنا عین عدل ہے اور اس سے ہٹنا ظلم ہے جو اللہ کو پسند نہیں ہے۔

اس آیت کا سیاق و سباق یہودیوں کے بارے میں ہے جن کے لئے اللہ نے تورات' بطور کتاب ہدایت نازل کی۔ تورات میں زندگی گزارنے کے لئے اصول تھے۔ ان اصولوں کا ذکر کرنے کے فوراً بعد مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی جس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں ہے کہ یہودیوں نے اللہ کے نازل کئے ہوئے قانون کے برعکس عمل کیا جو عدل نہیں ظلم ہے۔ اور اس سے مسلمانوں کو یاد دلایا جائے کہ اس ظلم کے بعد یہودیوں کی کیا حالت ہوئی؟ کیسے کیسے صحراؤں میں اسے خاک چھاننا پڑی؟ کس طرح اللہ کی محبوب قوم اس کی مغضوب ٹھہری

وطن چھنا' حکومت ہاتھ سے گئی اور اقتدار ختم ہوا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ اس قوم نے اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کی قدر نہ کی۔ اپنے لئے خود قوانین وضع کئے۔ عقل کو ان قوانین کا مدار قرار دیا۔ الہامی ہدایت کو پس پشت ڈالا۔ اور نتیجہ؟ صحراؤں کی خاک اور اللہ کا غضب!

یہودیوں کے اس مختصر' جامع' اشارات سے لبریز اور بلیغ ذکر کے بعد اگلی آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بیان آتا ہے۔ جن کو انجیل دی گئی جس میں روشنی اور ہدایت تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو بھی یہی حکم دیا گیا کہ اللہ کے احکام کے مطابق فیصلہ کرو۔ مختصراً ان کے بارے میں بھی کم و بیش وہی الفاظ دہرا دیئے گئے جو یہودیوں کے بارے میں کہے جا چکے تھے۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (مائدہ' ۵:۴۷)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ (قانون) کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔

سورۃ کے اس حصے کا اسلوب یہ بھی بتا رہا ہے کہ ان لوگوں نے بھی اللہ کے احکام عدل کا خیال نہیں رکھا۔

ان تاریخی حقائق کے بیان کے بعد خطاب کا رخ رسول اللہ کی طرف ہو جاتا ہے۔ کچھ دوسری باتوں کے بعد نظام عدل کے بارے میں اللہ نے حتمی حکم نازل فرمایا۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ (مائدہ' ۵:۴۸)

لہٰذا تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو

اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان (لوگوں) کی

خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

یہاں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے اور یہ خطاب ان کی سربراہ مملکت کی حیثیت کے لئے ہے۔ اس لئے آئندہ تمام سربراہان مملکت بھی اس آیت کے مخاطب ہیں جو حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے وہی حکم اب ہر اولی الامر کے لئے ہے۔ عہد جدید میں ریاست میں وسعت کے باعث اولی الامر بھی مختلف میدانوں میں مختلف ہیں۔ اس لئے اس آیت کے مخاطب ایسے تمام لوگ ہیں جو امور سلطنت میں فیصلے کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ گزشتہ تمام آیات کے مجموعی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی ریاست کی عدلیہ صرف قرآن و سنت کے احکام کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہے۔ اس سے متصادم قوانین کے مطابق فیصلہ کرنا احکام الٰہی کی

خلاف ورزی ہے۔

اسلامی ریاست میں عدلیہ کے ذریعے قانون سازی کے ضمن میں دوسرا اصول یہ ہے کہ وضع کیا جانے والا قانون، امتیازی (Discriminatory) نہ ہو۔ ایک عام فرد کے لئے جو پابندیاں اور سزائیں مقرر کی جائیں، کوئی بڑے سے بڑا عہدے دار حتیٰ کہ سربراہ مملکت بھی اس سے بچا ہوا نہ ہو۔ کسی شخص کا دعویٰ اگر سربراہ مملکت کے خلاف ہو تو قاضی (Judge) کو ایسے اختیارات حاصل ہوں کہ وہ سربراہ مملکت کو عدالت میں طلب کر سکے۔ اور دوران سماعت اس سے وہی برتاؤ ہو جو عام فرد سے ہو سکتا ہے اس کے مرتبہ کا مقدمہ سے کوئی تعلق واسطہ نہ ہو۔

اسلامی قانون سازی میں عرف کا مقام

عرف، مقامی رسم و رواج اور ملکی قانون کو کہتے ہیں جنہیں بعض فقہاء نے شریعت اسلامی کا بالترتیب گیارہواں اور بارہواں ماخذ قرار دیا ہے۔ عرف کی بحث ماخذ قانون سے متعلق ہے اور اسلام میں قانون سازی کا تصور اور طریق کار کے ضمن میں بظاہر اس کا تذکرہ موضوع سے ہٹ کر ہے۔ لیکن یہاں پر اس کو زیر بحث لانے کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں احیائے اسلام کی کوششوں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ماضی میں استعماری حکومتوں کے زیر اثر بننے والے تمام قوانین مکمل طور پر غیر اسلامی قرار نہیں دیئے جا سکتے بلکہ ان قوانین کے بہت سے اجزاء اصلاً عین اسلامی ہو سکتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر مسلم اور غیر ملکی حکمرانوں نے یہ قوانین بناتے وقت اسلام کو پیش نظر رکھا تھا بلکہ مقصد یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی کوششوں کو بلا سوچے سمجھے رد کر دینا مفید نہیں ہے تاوقتیکہ ان قوانین کا ایک نظر مطالعہ نہ کر لیا جائے۔

پاکستان میں جب وفاقی شرعی عدالت کو بعض میدانوں میں رائج الوقت ملکی قوانین پر نقد و جرح کا اختیار دیا گیا(۱۷) تو عدالت نے ماہرین قانون اور ماہرین شریعت کی آراء کی روشنی میں سینکڑوں قوانین کا مطالعہ کیا اور بہت سے قوانین کو مخالف اسلام نہ پانے کے بعد انہیں اسلامی قرار دیا۔ اس لئے آئندہ سطور میں قانون سازی میں رائج الوقت معاشرتی رسم و رواج اور ملکی قانون کا حصہ زیر بحث لایا جائے گا۔

باب دوم میں سنت کی تعریف میں آپ سنت کی چار اقسام کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ جن میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ سنت بھی ہے کہ جب آپ نے لوگوں کو کوئی عمل کرتے دیکھا اور اس طرح خاموشی اختیار کی کہ ہلکا سا بھی اظہار ناپسندیدگی ظاہر نہ ہوا اور اس طرح وہ عمل برقرار رہا تو یہ سنت تقریری ہے۔

سنت تقریری ملکی قانون اور عوام کے رسم و رواج کو قانونی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

یوں تو قانون کے بنیادی ماخذ قرآن و سنت ہیں لیکن اس بات کو دوسرے انداز میں بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ فی الاصل ملک کا دستور اور رسم و رواج ہی قانون کے ماخذ ہیں جن میں سے قرآن و سنت نے فاسد عناصر کو نکال کر انسانیت کو ایک پاک، صاف اور مکمل قانون دیا۔ بعثت محمدی سے قبل کے ماخذ قانون پہلی شریعتوں سے یقیناً متاثر تھے جن کا منبع اور مخرج ابراہمی شریعت تھا لیکن یہ بات سو فیصد درست نہیں ہے۔ شراب ہی کو لیجئے یہ پہلے کی شریعتوں میں بھی ممنوع تھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد طویل عرصے تک اس کا استعمال جائز رہا۔ اس کا یہ جواز صرف مکہ کے رواج پر قائم تھا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ شریعت اسلامی نے عرف کی شرعی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔

الکلمة الحکمة ضالة المومن فحیث وجدها فهو احق بها (۱۸)

حکمت (کے موتی) مومن کی متاع گم گشتہ ہے۔ وہ اسے جہاں سے پائے وہی اس کو لینے کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔

حکمت کے یہ موتی، رسم و رواج، ملکی قانون، زبان و ادب، فکر و فلسفہ اور طبعی علوم غرض کہ ہر جگہ سے مل سکتے ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کے مطابق ان کا سب سے زیادہ مستحق مومن ہے۔ گویا مومن کی یہ متاع گراں کفار نے غصب کر رکھی ہے جسے حاصل کرنا مومن کا فرض ہے۔ اس سلسلے کی بنیادی بات یہ ہے کہ اسلامی قانون اصلاً انسان کی فطرت سلیم پر قائم ہے جو روزمرہ کے ضابطے فطری طریقے پر خود بخود وضع کرتی رہتی ہے۔ جہاں جہاں فطرت سلیم نے بے بسی کا اظہار کیا یا ٹھوکر کھائی وہاں اللہ نے الہامی ہدایت بھیج دی۔ یہی اسلامی قانون ہے۔

اس اصولی بیان کے بعد یہ بات واضح کر دینا بے محل نہ ہو گا کہ موجودہ اسلامی قانون کی بنیاد اصل میں عرب کے اس رسم و رواج پر ہے جو ملت ابراہیمی اور شریعت ابراہیمی کے بقایاجات کے طور پر وہاں مروج تھا۔ اس رواجی قانون کے غلط اور بعد کے اضافہ شدہ عناصر کو نکال کر بقیہ امور میں ضروری اصلاح و اضافہ کے ساتھ اسلام نے اسے قبول کر لیا۔ اس بات کو ذیل میں چند مثالوں سے واضح کیا جاتا ہے۔

(۱) بعثت محمدی وقت کے عرب معاشرے میں انسانی قتل کی سزا قصاص و دیت تھی۔ دیت سے مراد یہ تھی کہ

قاتل مقتول کے ورثا کو سو اونٹوں کی صورت میں تاوان ادا کرے۔ یہ تعداد رسول اللہ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے مقرر کی تھی۔ جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ذرا تبدیل کر کے برقرار رکھا۔ دیت خلفائے راشدین کے عہد میں بھی رائج رہی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایک مستحسن رواج تھا۔ اس لئے نہ اللہ نے اس کی ممانعت نازل فرمائی اور نہ اس کو رسول اللہ نے ناپسند فرمایا۔ اسی لئے یہ آج بھی اسلام کے تعزیری قانون کی ایک اہم علامت ہے(۱۹)۔

(۲) اس زمانے میں عدالتی کارروائی کے لئے یہ سادہ سا اصول تھا کہ مدعی اپنے دعوے کے ثبوت میں گواہ مہیا کرے۔ گواہ مہیا ہو جاتے تو فیصلہ اس کے حق میں ہو جاتا تھا۔ دوسری صورت میں بھی مدعی کے حق میں فیصلہ ہو جاتا تھا بشرطیکہ مدعا علیہ اقرار کر لے لیکن انکار کی صورت میں اسے قسم کھانا پڑتی تھی۔ اسلامی شریعت نے اہل مکہ کے اس رواج سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ حدیث میں آتا ہے۔

البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیه (۲۰)

ثبوت (یا گواہ) مہیا کرنا مدعی کے ذمہ ہے اور قسم مدعا علیہ کے ذمہ ہے۔

(۳) خرید و فروخت کے کئی طریقے اس وقت کے معاشرے میں جاری تھے۔ سودی کاروبار عام تھا۔ اسلامی شریعت نے سود کو حرام قرار دیا، خرید و فروخت کے بعض طریقوں کو خلاف شرع قرار دیا اور بعض کو برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ علماء عربوں کے عرف کو ماخذ قانون قرار دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ عرف کے بارے میں فرماتے ہیں۔

هی ماده تشریعة (۲۱)

یہ (عربوں کا رسم و رواج) ماخذ شریعت ہے۔

عرف کے لئے ایک دوسرا لفظ (عادة) بھی اصول کی کتابوں میں بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ دونوں الفاظ کے معانی ایک ہی ہیں۔ مقامی رسم و رواج کو سند فراہم کرنے کے لئے یہ آیت بہت اہم ہے۔

وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (اعراف ۷: ۱۹۹)

عرف کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے نہ الجھئے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔

انتم اعلم بامر دنیاکم (۲۱)

تم اپنے دنیاوی امور میں (مجھ سے) زیادہ واقف ہو۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود کا قول ہے:

ماراہ المسلمون حسناً فھو عنداللہ حسن (۲۳)

جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ فطرت سلیمہ کی روشنی میں فیصلے کرتا ہے اور یہ اللہ کی تخلیق کا نتیجہ ہے۔

عرف شرع اور عرف اہل زمانہ میں تعارض

مشہور فقہی قاعدہ ہے۔

التعین بالعرف کالتعین بالنص (۲۴)

جو بات عرف (رسم و رواج) سے ثابت ہو وہ نص (قرآن و سنت) سے ثابت شدہ کے مثل ہے۔

فقہاؒ نے بعض مقامات پر اس سے بھی آگے بڑھ کر یہاں تک کہا ہے کہ شرعی عرف اور اہل زمانہ کے عرف میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو اہل زمانہ کا عرف مقدم ہوتا ہے۔ اسی کا اعتبار کیا جاتا ہے' اسی کو اولیت دی جاتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) تعلیم قرآن کے لئے اجرت لینا قرآن و سنت کی رو سے ناجائز ہے اور تابعین کے عہد تک یہ عرف قائم رہا کہ تعلیم قرآن کی اجرت لینا ناجائز ہے۔ قرآن و سنت کی بنیاد پر قائم ہونے کی وجہ سے یہ طریقہ عرف شرعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ بعد میں تعلیم قرآن کی اجرت لی جانے لگی کیونکہ معلمین اجرت نہ لیتے تو ان کے اہل و عیال بھوکوں مرتے' یہاں تک کہ اہل زمانہ نے مکمل طور پر تعلیم قرآن کی اجرت لینا جائز قرار دے دیا۔ اس سلسلے میں اصول یہ ہے کہ اگر شرعی عرف کی بنیاد' زمانہ رسالت کا عرف ہو اور زمانہ بدلنے سے عرف بدل گیا ہو تو نیا عرف شرعی عرف کی بنیاد بن جائے گا۔ (ابن عابدین' ردالمحتار' ج ۴' ص ۲۵۱' باب الربا' دارالطباعۃ العامرہ)

(۲) اسلامی شریعت زوجین میں سے شوہر کو پابند کرتی ہے کہ وہ بیوی کے نان نفقے کا بندوبست کرے۔ نان نفقے میں روٹی' کپڑا اور مکان شامل نہیں۔ کھانے کی تیاری' کپڑے دھونا اور گھر کی صفائی شرعاً عورت کی ذمہ

داری نہیں- یہ ضروریات پورا کرنا مرد کے ذمہ ہے لیکن موجودہ معاشرے کی کوئی عورت شادی کے بعد مرد سے مطالبہ کرے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرے تو اسلام کا نظام عدل اس کے حق میں فیصلہ نہیں دے گا کیونکہ نکاح کے وقت اس معاملہ میں سکوت اختیار کر کے عورت نے گویا یہ تسلیم کر لیا تھا کہ رہن سہن' معاشرتی رسم و رواج کے مطابق ہو گا اور معاشرتی رسم و رواج کے مطابق گھریلو کام کاج عورتیں کرتی ہیں- لہٰذا شرعاً" عورت کا حق ہونے کے باوجود عرف میں اس کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے اس کا دعویٰ درست نہیں ہے- البتہ اگر نکاح کے وقت عورت نے معاشرتی رواج کے برعکس اپنے شرعی حق کا دفاع کر کے اسے بطور شرط نکاح منوا لیا ہو تو اسے یہ حق آج بھی مل سکتا ہے-

عرف کی اقسام

فقہاء کے نزدیک عرف کی دو قسمیں ہیں- دونوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے-

۱- عرف عام

عرف کی یہ قسم کسی خاص پیشہ ورانہ گروہ' طبقہ یا علاقہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی- یہ قسم تمام معاشرے میں معروف ہوتی ہے اور ہر فرد اس سے باخبر ہوتا ہے اس کی شرائط کی پابندی رضا کارانہ اور بغیر کسی قانونی بندش کے کرتا ہے- جیسے اسی گزشتہ مثال میں بیان کیا گیا ہے کہ تمام دنیا میں گھر کے کام کاج عام طور پر عورتیں ہی کرتی ہیں یہ رواج عرف عام کہلاتا ہے- یہ عرف پورے معاشرے کا عرف ہوتا ہے-

۲- عرف خاص

عرف خاص عام لوگوں کی بجائے کسی خاص طبقہ' پیشہ ورانہ گروہ یا علاقے کے لوگوں کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے- اس قسم کے عرف کی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں جن کو متعلقہ لوگ ہی جانتے ہیں- عام لوگوں کے لئے یہ اصطلاحات یا تو اجنبی ہوتی ہیں یا ان کے معانی مختلف ہو سکتے ہیں- جیسے آج کل شہری کاروباری علاقوں میں کرایہ پر حاصل کی گئی دکان کرایہ دار اسی صورت میں خالی کرتا ہے جب اسے ایک مخصوص رقم ادا کی جائے- یہ رقم بعض صورتوں میں دکان کی قیمت کے مساوی بھی ہو سکتی ہے- اس رقم کو کاروباری عرف میں "پگڑی" کہتے ہیں- حالانکہ عرف عام میں پگڑی سر پر مخصوص انداز میں رکھی جانے والی پوشاک کو کہتے ہیں- لیکن عرف خاص میں اس نے

کثرت استعمال کی وجہ سے دوسرے معانی اختیار کر لئے ہیں۔

عرف قبول کرنے کے لئے شرطیں

یہ ضروری نہیں ہے کہ معاشرہ عرف بد کی بنیاد پر قائم ہونے والے رسم و رواج سے خالی ہو بلکہ برائی تقریباً ہر معاشرے میں اپنی ہیئت تبدیل کر کے کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتی ہے۔ اس لئے لازم آتا ہے کہ عرف کے رد و قبول کے لئے کچھ شرائط مقرر کی جائیں۔

جب مکہ کے عرف کا بطور ماخذ اسلامی قانون تذکرہ کیا گیا تھا تو یہ بھی ذکر کیا گیا تھا کہ اس عرف کو قرآن و سنت نے الہامی راہ نمائی کے ذریعے خالص کر دیا ہے۔ اس لئے یہ عرف اس حد تک ماخذ قانون ہے جس حد تک قرآن و سنت نے اس کی نفی نہ کی ہو۔ لیکن یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ ہر معاشرے کا عرف اسلامی قانون کا مأخذ ہے' بلکہ اسلام کی ہدایت آجانے کے بعد اب انسانیت کے لئے بنیادی مأخذ قانون قرآن و سنت ہیں اور تمام تہذیبوں اور معاشروں کے عرف کو اس کے تحت ہونا چاہیے۔ کوئی عرف قرآن و سنت کی تعلیمات سے متصادم ہو تو اس کی کوئی اصل نہیں لہٰذا قرآن و سنت کے عام حکم کے مخالف عرف کی شرع میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

وہ عرف بھی ناقابل قبول ہے جس پر عمل کرنے سے قرآن و سنت کے احکام میں سے کسی کو ترک کرنا پڑے۔

وہ احکام جو کسی عرف کے ساتھ مخصوص ہوں' عرف کے بدلنے سے خود بخود بدل جاتے ہیں۔ تفصیلی بحث کے لئے کتب فقہ دیکھئے۔

مزید مطالعہ کے لئے

اس باب میں قانون سازی (Legislation) کے اسلامی اصول اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ تفصیل کے ساتھ پڑھنے کے خواہش مند اصحاب سے گزارش ہے کہ مندرجہ ذیل کتب کا ضرور مطالعہ کریں۔

۱۔ خطبات بہاولپور' ڈاکٹر محمد حمیداللہ' مطبوعہ اسلام آباد۔

۲۔ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر' محمد تقی امینی' مطبوعہ لاہور۔

۳۔ اسلامی دستور کی تدوین' سید ابوالاعلی مودودی' مطبوعہ لاہور۔

۴۔ تفہیمات حصہ سوم' سید ابوالاعلی مودودی' مطبوعہ لاہور۔

۵۔ اسلامی ریاست' سید ابوالاعلی مودودی' مطبوعہ لاہور۔

۶ - خلافت و ملوکیت، سید ابوالاعلی مودودی، مطبوعہ لاہور۔
۷ - اسلامی سیاست، مولانا گوہر رحمان، مطبوعہ مردان۔
۸ - اسلامی ریاست، ڈاکٹر محمد حمیداللہ، مطبوعہ لاہور۔
۹ - اسلام کا نظام حکومت، مولانا حامد الانصاری غازی، مطبوعہ لاہور۔
۱۰ - اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور، رشید اختر ندوی، مطبوعہ لاہور۔
۱۱ - اسلامی ریاست، امین احسن اصلاحی، مطبوعہ لاہور۔
۱۲ - اسلام کا شورائی نظام، مولانا جلال الدین انصر عمری، مطبوعہ لاہور۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں توفیق دے کہ ہم اسلامی نظام قانون کی ترویج کے لئے کوشش کریں اور یہ کوشش ہماری نجات کا سبب بن جائے۔ آمین۔

حواشی و حوالہ جات

۱ - البخاری: الجامع الصحیح، کتاب الاحکام
۲ - البخاری: حوالہ ایضاً"
۳ - البخاری: حوالہ ایضاً"
۴ - صدیقی: خطبہ حجتہ الوداع، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۳
۵ - الترمذی: الجامع، ابواب الجہاد، باب ماجاء فی المشورہ
۶ - الترمذی: الجامع، ابواب الزہد
۷ - الترمذی: الجامع، ابواب الفتن، باب ماجاء فی النہی عن سب الریاح
۸ - علی المتقی: "کنزالعمال فی سنن الاقوال والافعال" بیروت، موستہ الرسالہ، ۱۹۸۵ء، ج ۵، ص ۶۴۸۔
۹ - یہ واقعہ کئی کتابوں میں ملتا ہے لیکن ابن قدامہ نے المغنی، میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے مہر کی تجدید کا ارادہ کیا تو قرآن کی آیت انہیں خود یاد آئی تو انہوں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ حوالہ کے دیکھئے: ابن قدامہ:

المغنی، بیروت، دارالمنار، ۱۳۶۷ھ، ج ۶، ص ۶۸۱

۱۰- البخاری: الجامع الصحیح، کتاب الاحکام

۱۱- الترمذی: الجامع، ابواب الفتن

۱۲- مودودی: اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء، ص ۲۹

۱۳- الترمذی: الجامع، ابواب الحدود

14. Federal Judicial Academy "The Constitution of the Islamic Republic of Pakistan Article 209 (1990)

۱۵- احمد رضا: معجم متن اللغۃ، بیروت، دارمکتبہ الحیاۃ ۱۹۵۹، ج ۳، ص ۶۶۴

۱۶- احمد رضا: حوالہ ایضاً، ج ۴، ص ۴۷

Article 203 ee . Ibid - 17

۱۸- الترمذی: الجامع، باب العلم، نیز ابن ماجہ: السنن، ابواب الزہد

۱۹- امینی: فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء، ص ۲۷۱

۲۰- الترمذی: الجامع، ابواب الاحکام

۲۱- شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، تفصیل کے لئے ۷۴ واں باب ملاحظہ کیجئے۔

۲۲- مسلم: صحیح، کتاب الفضائل

۲۳- العبدلی: مرویات ابن مسعود رضی اللہ عنہ، جدہ، دارالشروق ۱۹۸۵ء، ج ۱، ص ۳۱۳

۲۴- مجلّہ الاحکام العدلیہ، کراچی، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، مادہ ۴۵

مصادر و مراجع

۱- ابن قدامہ: عبداللہ بن احمد بن محمد ابن قدامہ (۶۲۰ھ) "المغنی" بیروت، دارالمنار، ۱۳۶۷ھ جلد ششم

۲- احمد رضا: "معجم متن اللغۃ" بیروت، دارمکتبہ الحیاۃ، ۱۹۵۹ء جلد سوم و چہارم

۳- امینی: محمد تقی، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء

۴- البخاری: محمد بن اسماعیل بن ابراہیم (۲۵۶ھ) "الجامع الصحیح" استنبول، دارالطباعۃ العامرہ

۵- الترمذی: محمد بن عیسیٰ بن سورۃ (۲۷۹ھ) "الجامع" استنبول، دارالدعوۃ، ۱۴۰۱ھ

۶- شاہ ولی اللہ: قطب الدین احمد بن شیخ عبدالرحیم (۱۱۱۴ھ) "حجۃ اللہ البالغۃ" لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز،

۱۳۹۱ھ

۷ - صدیقی: محمد میاں، "خطبہ حجتہ الوداع" اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۸۵ء

۸ - العبدلی: الشریف منصور بن عون "مرویات ابن مسعود رضی اللہ عنہ فی الکتب الستہ و موطا و مسند احمد" جدہ، دارالشروق، ۱۹۸۵ء جلد اول

۹ - علی المتقی: علامہ علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الہندی، برہان پوری (۹۷۵ء) "کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال" بیروت، موسسہ الرسالہ، ۱۹۸۵ء، جلد پنجم

۱۰ - مجلۃ الاحکام العدلیہ: کراچی، نور محمد کارخانہ تجارت کتب

۱۱ - مسلم: ابوالحسین مسلم بن الحجاج (۲۶۱ھ) "صحیح مسلم" استنبول، دارالدعوۃ، ۱۴۰۱ھ

۱۲ - مودودی: سید ابوالاعلی (۱۹۷۹ء) "اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر" لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء

13. Federal Judicial Academy, Islamabad. The Constitution of the Islamic Republic of Pakistan, 1990.

''مطالعہ اسلامی قانون'' کے مطبوعہ مضامین

۱۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ اول۔قرآن

۲۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ دوم۔سنت

۳۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ سوم۔اجماع

۴۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ چہارم۔قیاس

۵۔ اجتہاد کی تعریف

۶۔ اسلام میں قانون سازی کا تصور اور طریق کار

۷۔ دینی مسائل میں اختلاف، اسباب اور ان کا حل

۸۔ اسلام کا قانون نکاح وطلاق

۹۔ اسلام کا قانون وراثت ووصیت

۱۰۔ اسلام میں عورت کی استثنائی حیثیت اور اس کی وجوہ

۱۱۔ اسلام کا تصور ملکیت ومال

۱۲۔ اسلام کا تصور معاہدہ

۱۳۔ اسلام میں شراکتی کاروبار کا تصور

۱۴۔ مزارعت اور مساقات

۱۵۔ اسلام کا نظام محاصل

۱۶۔ اسلام کا نظام مصارف

۱۷۔ اسلام میں عدل وقضاء کا تصور

۱۸۔ اسلام کا نظام احتساب

۱۹۔ اسلامی نظام عدل وقضاء میں شہادت کا تصور

۲۰۔ اسلام کا تصور جرم وسزا

۲۱۔ اسلام کا فوجداری قانون

۲۲۔ اسلام کا دستوری قانون

۲۳۔ اسلام کا قانون بین الممالک

۲۴۔ اسلام میں ربا کی حرمت اور بلاسود سرمایہ کاری